بابت ۱۴۳۵ھ/۲۰۱۴ء

بسلسلہ ''عالم اسلام کے مشہور مفکرین''

پهلا محاضره علميه

برموضوع

الامام محمد قاسم النانوتویؒ

حیات وتحریکات

از

محمد شمشاد رحمانی قاسمی

استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

باهتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند

فہرست مضامین

............❖............

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حق جل مجدہٗ نے ہر دور میں ایسے رجالِ کار پیدا کئے جنہوں نے دین متین کی صحیح تشریح وتوضیح امت کے سامنے پیش کی اور دین اسلام کی تصویر کو دھندلا کرنے اور اس کے صاف چہرہ کو مسخ کرنے والوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ انہی نابغہ روزگار شخصیات میں حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی ذات گرامی بھی ہے، جنہیں اللہ رب العزت نے اہم دینی، علمی، اصلاحی خدمات کے لئے پیدا فرمایا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ مسلمانوں کی بساط باضابطہ لپیٹی جا چکی تھی، مسلمان ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے انقلاب ۱۸۵۷ء تک کی مسلسل شکست خوردگی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم و جارحیت نے مسلمانوں کو لاچار، بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔ ایک طرف مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے بازیافت کا مسئلہ تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کے ایمان ویقین کی حفاظت کا۔

حضرت نانوتویؒ نے دونوں مسئلوں پر توجہ فرمائی، چنانچہ جہاد شاملی اگر پہلے مسئلہ کے حل کے لئے تھا تو قیامِ دارالعلوم دوسرے اہم مسئلہ کے لئے بنیادی ستون ہے۔

’’دارالعلوم‘‘ محض ایک مدرسہ نہ تھا بلکہ وہ ایک تحریک تھی، جو دیوبند کے گمنام بستی سے اٹھی اور اقصائے عالم میں پھیل گئی۔ حضرت شیخ الہندؒ اسے اسلامی چھاؤنی قرار دیتے تھے، اسے محض ایک درسگاہ کی شکل میں دیکھے جانے کے قائل نہ تھے۔ اگر آج دارالعلوم کی شکل میں تحریک مدارس کا آغاز نہ کیا جاتا اور لارڈ میکالے کا منہ توڑ جواب نہ دیا جاتا تو آج ہندوستانی مسلمان سب کچھ کے باوجود مسلمان نہ ہوتے، ان کے گھروں سے قرآن کی آواز کے بجائے بائبل کی آواز آتی۔ اللہ تعالیٰ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی قبر پر شبنم افشانی کرے انہوں نے ایسی جاں گسل اور مشکل حالات میں ملت اسلامیہ ہندیہ کی رہنمائی فرمائی جہاں دور

دور تک اس کی حفاظت کا کوئی سامان نظر نہ آتا تھا۔

حضرت نانوتویؒ کا ایک امتیازی وصف بے پناہ کسر نفسی اور فنائیت ہے، دارالعلوم قائم کیا، اسے دین کا مضبوط قلعہ بنایا، لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ پیچھے رکھا اور چھپانے کی کوشش کی۔ بنیاد رکھی تھی تو کسی اور بزرگ کے ہاتھ رکھوائی، انتظام واہتمام کا شعبہ کسی اور بزرگ کے حوالے کیا، تدریس کسی اور کے حوالے مگر فرمانِ رسول B ’’من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ‘‘ جو اپنے آپ کو بچھاتا اور چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلندیاں عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ آج دارالعلوم دیوبند کی پیشانی پر آپ کا نام سنہرے حروف سے کندہ ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ اسلام کے خلاف اٹھنے والے ہر طوفان کے سامنے سینہ سپر ہوجاتے تھے، عیسائیت کا فتنہ ہو یا آریہ سماجی یا کوئی اور باطل تحریک۔ انہوں نے اہل سنت والجماعت کے باہمی فروعی اختلاف کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ افسوس کہ ہم ان خصوصیات قاسمی سے محروم ہوتے جارہے ہیں، دفاع عن الاسلام کی طرف ہماری توجہ کم ہوگئی ہے اور باہمی اختلافات کی طرف ہماری توجہ بڑھ گئی ہے۔ تواضع وسادگی و توکل کی راہ چھوڑ کر ہم عہدہ واقتدار اور خودنمائی کی راہ پر چل پڑے ہیں۔

الغرض حضرت نانوتویؒ کی شخصیت اتنی متعدد الجہات اور ہمہ گیر ہے کہ آپؒ کی خدمات کا مختصر تعارف بھی ایک طویل دفتر کا محتاج ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے ان تمام محاذوں پر انقلابی انداز سے محنت کی جن پر توجہ کی اس وقت ضرورت تھی۔ آپؒ نے اپنی شبانہ روز محنتوں سے خدمات اور کارناموں کا جو عظیم دفتر تیار کیا ہے موجودہ دور کے تناظر میں ان تمام کارناموں کو جدید تقاضے کے مطابق امت اسلامیہ کے سامنے لانے کی ضرورت تھی، یہ وہ عظیم ہدف ہے جسے بروئے کار لانے کے لئے خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم نے انقلابی قدم اٹھایا اور دارالعلوم وقف دیوبند میں ’’حجۃ الاسلام اکیڈمی‘‘ قائم کی اور اس کی ذمہ داری اپنے لائق نوجوان اور فعال حفید محترم جناب مولانا محمد شکیب قاسمی صاحب کے سپرد کی۔

اب یہ اکیڈمی مولانا موصوف کی نظامت میں اپنے مقاصدِ حسنہ کی طرف رواں دواں ہے۔ اکیڈمی نے سالِ رواں یہ فیصلہ کیا کہ دورِ حاضر کے تناظر میں مختلف عناوین پر محاضرے تیار کئے جائیں۔ ''عالم اسلام کے مشہور مفکرین'' موضوع پر محاضرہ لکھنے کی ذمہ داری احقر کے سپرد کی، یہ محاضرہ دراصل اسی حکم کی تعمیل ہے۔

محاضرہ کی وسعت کے پیش نظر اسے کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا محاضرہ حضرت نانوتویؒ کی شخصیت اور آپ کی تحریکات سے متعلق ہے۔ اگلا محاضرہ انشاء اللہ حضرت کے علمی وعملی خدمات پر مشتمل ہوگا۔

وما توفیقی الا باللہ

محمد شمشاد رحمانی قاسمی
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند
۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ

............❖............

پہلا باب

سوانحی خاکہ

حجۃ الاسلام الامام الکبیر حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ولی اللٰہی خوانِ علم کے آخری خوشہ چینوں میں تھے، ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ سہارنپور کے نواح میں ایک قدیم مردم خیز قصبہ نانوتہ ہے، اسی معدن سے یہ جوہر فرد نکلا، جس کے انوارِ علم نے تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر کی علمی، مذہبی مجالس کو منور اور تاباں بنادیا تھا۔ ابتدائی تعلیم وطن مالوف میں حاصل کی۔ مکتبی تعلیم کے بعد ان کو دیوبند پہنچادیا گیا۔ یہاں کچھ دنوں مولوی مہتاب علی کے مکتب میں پڑھا، پھر اپنے نانا کے پاس سہارنپور چلے گئے جو وہاں وکیل تھے، سہارنپور میں مولوی نواز سے عربی صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء کے آخر میں ان کو حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ اپنے ہمراہ دہلی لے گئے۔ وہاں کافیہ شروع کیا اور دوسری کتابیں پڑھیں، بعد ازاں انہیں دہلی کالج میں داخل کردیا گیا مگر حضرت نانوتویؒ نے سالانہ امتحان میں شرکت نہیں کی۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ لکھتے ہیں:

''والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعدِ حساب کی مشق کرلو، چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے ہیں، حساب پورا کرلیا ہے۔ منشی ذکاء اللہ صاحب چند سوال لائے، وہ نہایت مشکل تھے، ان کو حل کرلینے پر مولانا کی بہت شہرت ہوئی۔ جب امتحانِ سالانہ کے دن ہوئے تو مولانا امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ کو بالخصوص ہیڈ ماسٹر صاحب کو نہایت افسوس ہوا۔'' (۱)

دہلی کالج میں داخلہ سے پہلے مولانا مملوک علی صاحبؒ سے منطق وفلسفہ وکلام کی

(۱) سوانح قاسمی، ص۴، مصنفہ مولانا یعقوب صاحب

کتابیں میر زاہد، قاضی مبارک، سدرہ، شمس بازغہ وغیرہ ان کے مکان پر پڑھ چکے تھے، آخر میں اس حلقہ درس میں حاضر ہوئے جو علوم قرآن وحدیث میں سارے ہندوستان میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مسند علم پر حضرت شاہ عبدالغنیؒ مجددی رونق افروز تھے۔ ان سے علم حدیث کی تحصیل کی، زمانہ طالب علمی ہی میں ان کی ذہانت، علم وفضل اور فہم و فراست کی شہرت عام ہوگئی تھی۔

سرسید کا اعتراف

حضرت نانوتویؒ کے نامور ہم عصر سرسید مرحوم بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے زمانہ طالب علمی میں ان کی ذہانت، علم وفضل اور زہد وتقویٰ اور فہم وفراست کی نسبت اپنے تاثرات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

''لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ مگر مولوی محمد قاسم صاحب نے اپنی کمال نیکی دین داری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دہلی کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی اسحاق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ'' زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم وفراست میں معروف ومشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل وکمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ صاحب کے فیض صحبت نے ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ وہ کچھ خواہش پیر ومرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال اور مغرب میں ہزار ہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا ومقتدا جانتے تھے۔ تحصیل علم کے بعد مولانا نانوتوی نے ذریعہ معاش کے لئے مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے مطبع احمدی دہلی میں اپنے لئے تصحیح کتب کا کام اختیار کیا۔ اسی زمانہ میں حضرت مولانا احمد علی صاحب کی فرمائش پر صحیح بخاری کے آخری چند پاروں کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا۔ تصحیح کتب کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ

جاری رہا۔ صحاح ستہ کے علاوہ مثنوی مولانا روم اور دوسری کتابیں بھی پڑھاتے تھے مگر درس کسی مدرسہ کے بجائے مطابع کی چہار دیواری، مسجد یا مکان پر ہوتا تھا جہاں خاص خاص تلامذہ زانوئے ادب طے کرتے تھے۔

تواضع واستغناء

مزاج مین استغناء اور عجز وانکسار اس درجہ کا تھا کہ علماء کی مخصوص وضع جبہ ودستار وغیرہ کا کبھی استعمال نہ کیا۔ تعظیم سے بہت گھبراتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ ''اس نام کو علم نے خراب کیا، ورنہ اپنی وضع کو ایسی خاک میں ملاتا کہ کوئی یہ بھی نہ جانتا کہ قاسم نامی کوئی شخص پیدا بھی ہوا تھا۔'' ۱۲۷۷ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئے، واپسی کے بعد مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح کتب کی ملازمت کر لی۔ اس دوران درس وتدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا مگر کسی مدرسہ کی ملازمت کبھی پسند نہ کی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند آپ ہی کا ساختہ پرداختہ ہے، اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسہ کی مدرسی قبول فرمالیجئے اور اس کے عوض کسی قدر تنخواہ مگر قبول نہ فرمایا اور کبھی کسی طور اور ڈھنگ سے ایک حبہ تک کے لئے مدرسہ سے روادار نہ ہوئے حالاں کہ رات دن مدرسہ کی خوش اسلوبی میں مصروف رہتے اور تعلیم میں مشغول اور اگر کبھی مدرسہ کے قلم ودوات سے اپنا کوئی خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسہ کے خزانہ میں داخل کر دیتے۔(۱)

............❖............

(۱) ملخص از تاریخ دار العلوم، جلد۱، ص۱۰۲-۱۱۶

دوسرا باب

تحریک جہاد

اصلاح کا پہلا قدم

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی مذکورہ بالا ''اصلاحی خدمات جن کا تعلق خود مسلمانوں اور ان کے مختلف طبقات کی دینی زندگی سے تھا، ان خدمات میں آپ کب سے مشغول ہوئے، صحیح طور پر اس کا متعین کرنا دشوار ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کا علم حق و باطل کی امتیازی قوت جیسے جیسے نشو ونما پاتی جاتی تھی، اس موروثی جائیداد کی تقسیم پر نظر ثانی غالباً اس راہ میں آپ کا پہلا قدم تھا۔

دائرہ میں وسعت

گویا خود اپنے نفس سے چاہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ اصلاح کی ابتداء ہوئی اور عقد بیوگان کے مسئلہ کی نوعیت سمجھنا چاہئے: وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ کے ربانی فرمان کی تمثیلی شکل تھی، بہ تدریج یوں ہی دائرے میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی تا ایں کہ سنیوں کے بعد اپنے احاطہ میں شیعوں کو بھی اس نے سمیٹ لیا۔(۱)

دفاعی اقدامات

آپ کی ''داخلی خدمات'' کے متعلق آپ کے ساتھ امتیازی خصوصیت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، آپ کے ساتھ دوسرے اہل علم و دین کا بھی ان خدمات میں کافی حصہ ہے، لیکن داخلی خدمات کے مقابلہ میں ''دفاعی اقدامات'' کے زیر عنوان حضرت نانوتویؒ کی جن مخلصانہ مساعی اور سرفروشانہ مجاہدات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، یہ عجیب بات ہے کہ عمر کی یہ منزل جس میں

(۱) سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۷۹

داخل ہونے کے بعد کام لینے والے نے آپ سے یہ مہمات انجام دلائے، بہ مشکل تیس سال سے زیادہ کی مدت نہیں ہوتی ہے، اسی محدود مدت میں حالات ہی کچھ ایسے پیش آئے کہ پے درپے، یکے بعد دیگرے ایسے مہمات کی سرانجامی کے لئے قدرت کی طرف سے آپ کا انتخاب ہوا، جن کے آثار ونتائج، ثمرات وبرکات سے نہیں کہا جاسکتا کہ مستقبل کی کتنی صدیاں متاثر ومستفید ہوتی رہیں گی۔(۱)

تحریک جہاد کا پس منظر

مئی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے جس وقت حضرت نانوتویؒ کی عمر ۲۶/۲۵ سال تھی، دہلی میں تصحیح کتب کی ملازمت کررہے تھے۔ میرٹھ کی فوجی چھاؤنی میں بغاوت ہوگئی، مسئلہ چربی لگے کارتوس کا تھا، انگریز گورنمنٹ چاہتی تھی کہ گائے اور سور کی چربی کارتوسوں پر لگا کر دونوں کے مذہب کو برباد کردے لیکن یہی مسئلہ ان کے لئے شعلۂ جوالہ بن گیا اور فوجیوں نے چن چن کر سارے انگریز افسران کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا، اب کوئی انگریز افسر نہیں تھا، فوجیوں نے اعلان کردیا کہ ''دہلی چلو: بہادر شاہ ظفر ہمارا بادشاہ ہے، اسی کی قیادت میں جنگ کرکے انگریزوں کو ملک سے باہر نکالیں گے۔'' بغاوت کی یہ آگ پورے ملک میں پھیل گئی، خصوصاً مغربی اتر پردیش میں اس کا زیادہ اثر تھا۔

رئیس تھانہ بھون قاضی عبدالرحیم کی پھانسی

ادھر دوسری وجہ یہ ہوئی کہ انہی ایام میں تھانہ بھون کے ایک جاگیردار قاضی عبدالرحیم ہاتھی خریدنے سہارنپور گئے ہوئے تھے، کسی نے انگریز پولیس کو خبر کردی کہ تھانہ بھون میں بغاوت پھیلی ہوئی ہے اور وہاں سے قاضی صاحب اسی کی تیاری کے لئے ہاتھی خریدنے آئے ہیں، فوراً گرفتار کرلیا اور بلاتاخیر وبلاتحقیق انہیں پھانسی دیدی گئی۔

(۱) سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۸۱

ردِّعمل

اس کے ردِّعمل میں ان کے بھائی قاضی عنایت علی نے انگریزوں سے بدلہ لینے کی ٹھان لی اور مقابلہ کی تیاری شروع کردی، اطلاع ملی کہ بہت سے کہار بگیوں پر کارتوس لادے سہارنپور سے کیرانہ جارہے ہیں، اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئے اور ان پر حملہ کردیا، کارتوس و دیگر اشیاء چھین کر فوجیوں کو تہہ تیغ کردیا، جس سے تھانہ بھون اب بغاوت کی لپیٹ میں آچکا تھا، انگریز متحرک ہوگئے اور ارادہ کرلیا کہ تھانہ بھون کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے۔

جبراً عیسائی بنادیئے جانے کا فیصلہ

اس بغاوت سے پہلے ہی انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہوچکا تھا، بہادر شاہ ظفر کے اختیارات سلب کرلئے گئے تھے، انگریزوں کے رعب وہیبت کا یہ عالم تھا کہ زبانوں پر تالے تھے، ظالم و جابر حکومت کی پارلیمنٹ نے یہ فیصلہ سنادیا تھا کہ ہندوستان کے ایک ایک فرد کو عیسائی بنادیا جائے اور عیسائیت کی تبلیغ کے لئے ہزاروں پادری ملک میں دندناتے پھر رہے تھے اور اسلام پر دل آزار جارحانہ لب ولہجہ میں تنقیدیں کرتے تھے، جن کو سن کر مسلمانوں کے لئے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا دشوار ہورہا تھا۔

مشورہ کے لئے اکابر کا اجتماع

ان حالات وواقعات کو دیکھ کر علماء وصلحاء بے چین ہوگئے، تھانہ بھون میں مشورہ رکھا جس میں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حافظ ضامن شہیدؒ، مولانا محمد منیر نانوتویؒ وقت کے مقتدر علماء و مشائخ شریک ہوئے کہ ایسے حالات جبکہ نہ جان و مال محفوظ ہے اور نہ ہی دین کی ضمانت، باہم علمی گفتگو چھڑی، اس موقع پر جہاد کے سب خلاف تھے، صرف الامام الکبیر حضرت نانوتویؒ مدعیانہ طریقہ پر اس میں پیش پیش تھے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے لکھا ہے کہ سب نے جو حجتیں خلاف میں پیش کیں حضرت نانوتویؒ نے جوش کے ساتھ سب کا مدلل اور مسکت جواب دیا۔

مجلس کے ایک رکن مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ جو حضرت شاہ اسحاق کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے حضرت نانوتویؒ سے عمر میں بہت زیادہ بڑے تھے۔ انہوں نے بالآخر یہ عذر یہ پیش کیا کہ:

''اگر آپ کی حجتیں اور باتیں مان بھی لی جائیں تو سب سے بڑی شرط جہاد نصب میں امام کی ہے۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے''؟

حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے؟ حضرت مرشد حق حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ موجود ہیں، ان ہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے۔

سب لوگ حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گزران دشوار ہے اور یہ مفروضہ پیش کیا گیا: ''آپ چوں کہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظمِ حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قضیئے چکادیا کریں۔(۱)

جہاد کا قطعی فیصلہ

یہ انتخاب ایسا برمحل تھا کہ اس کے خلاف کسی کو لب کشائی کی ہمت ہی نہیں ہوئی کیوں کہ حاجی صاحبؒ کی عظمت واحترام پر ہر دل مطمئن تھا اس لئے مجلس شوریٰ میں آپ کو امیر المؤمنین منتخب کرکے جہاد کا قطعی فیصلہ کرلیا گیا۔(۲)

جہادی عہدیداروں کا انتخاب

جہاد کے حتمی فیصلہ کے بعد اسی مجلس میں عہدیداروں کا انتخاب بھی عمل میں آیا چوں کہ نظم ونسق اور باضابطگی جہاد کی اہم ترین شرط ہے، حاجی صاحب امیر المؤمنین بنائے

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج۱،ص۷۴ (۲) حیات اور کارنامے، ص۸۳

گئے، حافظ ضامن شہیدؒ صدر مجلس جنگ حضرت نانوتویؒ چیف کمانڈر اور مولانا منیر نانوتویؒ کمانڈر ان چیف بنائے گئے۔

والدین سے اجازت جہاد

جب اس پر اتفاق ہوگیا کہ اس وقت جہاد فرض ہے (اور آپ کو چیف کمانڈر بنا دیا گیا) تو آپ اپنے مکان نانوتہ تشریف لے گئے اور اپنی والدہ صاحبہ کے پاؤں دباتے ہوئے راہِ خدا میں جان دینے کے فضائل بیان کرنے لگے اور مختصر وموثر تمہید کے بعد فرمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ آپ خوشی سے مجھے اجازت دیدیں تاکہ آپ کو بھی اجر ملے۔''

چنانچہ حضرت نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ بڑی سمجھ دار تھیں، فرمانے لگیں ''بیٹے تم اللہ ہی کی چیز ہو، میں خوشی سے تمہیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتی ہوں'' اور اپنے اکلوتے بیٹے کو ایمان ویقین سے لبریز ان جملوں پر رخصت کیا ''اگر تم زندہ آگئے تو میں تم سے مل لوں گی نہیں تو آخرت میں جلد ہی ملنا ہوگا۔''

اس کے بعد اپنے والد بزرگوار شیخ اسد علی کی خدمت میں اجازت کے لئے حاضر ہوئے اور نہایت عاجزی ونرمی کے ساتھ اپنے عزم کا اظہار کیا، والد بزرگوار نے اپنی پگڑی منگوائی اور سر پر باندھا۔

بیٹا (حضرت نانوتویؒ) ابا جی! یہ کیوں باندھ رہے ہیں؟

باپ (شیخ اسد علی) ''تیرے ساتھ سر کٹانے آخر میں بھی جاؤں گا۔''

بیٹا (قاسم نانوتویؒ) ''آپ میری وجہ سے کیوں سر کٹاتے ہیں، اگر آپ کو سر کٹانا ہو تو اللہ کے لئے کٹایئے اور میرے ساتھ چلئے۔''

الحاصل اجازت دینے میں والد نے جب تأمل کیا تو مجاہد جلیل قاسم العلوم والخیرات نے ''**لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق**''(۱) پر عمل کیا اور یہ کہتے ہوئے کہ ''بندہ

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۱۲، ص:۵۴۶۔

رخصت ہوتا ہے السلام علیکم۔

یہ کہتے ہوئے جہاد کی تیاریوں کے لئے نکل پڑے، پھر والد بھی راضی ہوگئے۔

جنگ کا آغاز

مشورہ ہوا کہ امیر المؤمنین فی الجہاد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ تھانہ بھون میں رہیں اور سریہ شاملی کی تحصیل پر اولاً حملہ کرکے فتح کرے، لوگ جوق در جوق، جماعت در جماعت شاملی کی طرف دوڑ پڑے اور تھوڑی ہی دیر میں مجاہدین بہ آسانی وہاں پہنچ گئے، وہاں ایک کچا قلعہ تھا، جس میں انگریزوں کی فوج رہتی تھی، دونوں طرف سے بندوقیں نکل آئیں، تلواروں کا وار شروع ہوگیا۔

حضرت نانوتویؒ کی شجاعت وبہادری

جب سریہ روانہ ہوا تھا تو حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ کو بوقتِ روانگی جو وصیت کی تھی اس کے الفاظ ہیں:

''مولانا (یعنی حضرت نانوتویؒ) بالکل آزاد اور جری ہیں، ہر صف میں بے محابا گھس جاتے ہیں، اس لئے آپ کسی وقت ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔'' خصوصاً مولانا منیر صاحب کو یہ وصیت اس لئے کی تھی کہ شدتِ محبت سے ان کو بھی بغیر مولانا نانوتویؒ کے قرار نہ آتا تھا، گویا کام ایسے آدمی کے سپرد کیا جو یہی کرنا چاہتا تھا، اس واقعہ سے حضرت کی جرأت، شجاعت اور بسالت پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک مثالی جنگی چال

حضرت نانوتویؒ میدانِ جنگ میں لڑ رہے تھے اور بے خوفی سے انگریزی فوجوں میں گھس گھس کر گاجر اور مولی کی طرح ان کے سر قلم کر رہے تھے، میدانِ کارزار گرم تھا، آپ تھوڑی دیر بغرض آرام ایک کنارے میں بیٹھ گئے، اچانک ایک دیو ہیکل، دراز قامت، جیم و

شقیم شخص موقع غنیمت پاکر قریب آیا اور آپ کو مخاطب کر کے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ''تم نے بڑا سرابھارا ہے، لواب مزہ چکھو'' یہ کہتے ہوئے تلوار بلند کی اور للکار کر کہا'' یہ تیغہ تیرے لئے موت کا پیغام ہے۔'' اور تلوار کا وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ حضرت نے کڑک کر ڈانٹتے ہوئے کہا کہ:

''باتیں کیا بنا رہا ہے، اپنے پیچھے کی تو خبر لے۔''

اس نے سوچا کوئی حملہ آور میرے پیچھے ہے، اس نے بے اختیاری طور پر مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا، اس کا مڑنا تھا کہ حضرت نانوتویؒ نے ایسی قوت سے تلوار چلائی کہ تلوار دائیں مونڈھے کو کاٹ کر گزرتی ہوئی بائیں پیر پر آ کر رکی، دیکھا گیا تو اس سپاہی کا جسم زمین پر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ

''سر سے پیر تک دو ٹکڑا ہو کر آدھا اِدھر آدھا اُدھر گرا ہوا تھا''

جرأت واستقامت کا بےنظیر واقعہ

دورانِ جنگ انگریزی فوج قلعہ میں بند ہوگئی اور وہاں سے مجاہدین کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور قلعہ کے چاروں طرف سوائے ایک چھوٹی مسجد کے جو پھاٹک کے جانب تھی اور کچھ بھی نہ تھا جہاں یہ مجاہدین گولیوں سے اپنے کو بچا سکیں، مسجد سے جوں ہی نکلتے انگریزی فوج گولیاں برسانا شروع کر دیتی، اس موقع پر حضرت نانوتویؒ نے جرأت واستقامت کی ایک عجیب مثال رقم کی۔ واقعہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی زبانی سنتے ہیں:

مولانا لکھتے ہیں: اس وقت اپنے ہوش وحواس کے توازن کو قائم کرتے ہوئے الامام الکبیر نے ایک غیر معمولی جرأت آزما اقدام کا عزم بالجزم فرمالیا۔ یہ مسجد اسی سمت میں واقع تھی، جس میں گڑھی (قلعہ) کا دروازہ تھا، اسی دروازہ کے قریب چھپر کی ایک کٹی تھی جو غالباً محافظ سپاہیوں کے سایہ لینے کے لئے بنائی گئی تھی، مسجد سے الامام الکبیر کی نظر مبارک دروازہ کے اس چھپریا پر پڑی اور اچانک ایک ''حربی کمیدہ'' یا ''جنگی چال'' کا گویا آپ کو الہام ہوا۔ سمجھ میں یہ آیا کہ اس ''چھپریا'' تک پہنچنے کی صورت اگر کوئی نکل آئے تو اس کو اکھاڑ کر

دروازے کے کواڑوں پر رکھ دیا جائے اور چھپریا میں آگ لگا دی جائے، جس سے کواڑ بھی جل جائے گا اور یوں تحصیل کی گڑھی میں گھسنے کا موقع مجاہدین کے لئے بہ آسانی نکل آئے گا لیکن ظاہر ہے کہ مسجد سے چھپریا تک پہنچنا آسان نہ تھا۔

بندوقیں چھتیائے انگریزی فوج کے سپاہی گڑھی کی دیواروں پر اور ان کی آڑ میں پوری نگرانی کر رہے تھے کہ گڑھی کے دروازے تک کوئی پہنچنے نہ پائے۔ نظر پڑتے ہی اس پر گولیاں برسانے لگتے تھے۔ چھپریا تک پہنچنا، اس کو اکھاڑنا، اکھاڑ کر دروازے کے کواڑوں سے اس کا اتصال پیدا کر کے آگ لگانا اتنا لمبا کاروبار تھا کہ بمشکل ہی اس کا موقع برستی ہوئی گولیوں کے درمیان نکالا جا سکتا تھا، مگر اس کو کیا کیجئے کہ اولوالعزموں کے عزم اور ارادہ کا مظاہرہ ان ہی نازک مواقع پر ہوا کرتا ہے۔ تجویز بھی الامام الکبیر کے دماغ میں آئی اور تجویز پر عمل کرنے کا عزم بھی خدا نے آپ ہی کے نورانی قلب میں پیدا کیا۔

الامام الکبیرؒ اپنی اس ''آتشیں تجویز'' پر عمل کرنے کے لئے تنہا آمادہ ہوگئے، کسی رفیق کو بھی رفاقت کی تکلیف نہ دی اور دیکھا گیا کہ کوندتی ہوئی بجلی کی طرح آپ گولیوں کی اسی بارش کے درمیان نکلتے ہوئے چھپریا تک پہنچ گئے۔

''الامام الکبیرؒ حضرت نانوتویؒ نے پھرتی سے بڑھ کر اس چھپریا کو اپنی جگہ سے جلد جلد اکھاڑا اور اکھاڑ کر اسے تحصیل کے دروازے سے لاملایا اور اس میں آگ لگا دی۔''

خدا ہی جانتا ہے کہ گولیوں کی بوچھار سے نکلنے میں اور چھپریا تک صحیح وسالم پہنچنے میں وہ کیسے کامیاب ہوئے مگر دیکھا یہ گیا کہ چھپریا میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد آگ کا لگنا تھا کہ گڑھی کے پھاٹک کے کواڑ بھی جل اٹھے۔ صورت حال کچھ ایسی پیش آئی کہ ان جلتے ہوئے کواڑوں کی آگ بجھانے کی ہمت گڑھی کے محصور فوجوں کو نہیں ہوئی، بجائے لکڑی کے صرف کوئلہ اور راکھ کے کواڑ بن کر وہیں رہ گئے۔ یوں گڑھی کا بند دروازہ مجاہدین کے لئے وا ہوگیا اور یلغار کرتے ہوئے تحصیل کے اندر مجاہدین جا گھسے۔ اس وقت چارۂ کار ہی محصوروں

کے لئے اس کے علاوہ اور کیا تھا کہ نیام سے تلواروں اور کرچوں کو نکال نکال کر مجاہدین سامنے آجائیں کہ مجاہدین اور قلعہ بند فوج کے درمیان دست بہ دست جنگ ہونے لگی۔

گڑھی کے اندر تو یہ دست بدست جنگ ہورہی تھی، مجاہدین کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا، کرائے کے سپاہی ان کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتے تھے۔

''پانسہ مجاہدین کے حق میں پلٹ آیا، انگریزی فوج کو شکست ہوگئی، تحصیل شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہوگیا۔''(۱)

حضرت نانوتویؒ کی کرامت

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اپنے جہادی یادداشت میں لکھا ہے کہ اسی جہادِ شاملی میں حضرت کو بھی گولی لگی تھی، مولانا عاشق الٰہی نے بایں الفاظ نقل کیا ہے:

''حضرت مولانا قاسم العلوم والخیرات ایک مرتبہ یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، بعض نے دیکھا کہ کنپٹی میں گولی لگی اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔ اعلیٰ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:

''کیا ہوا میاں؟''

''عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا تو کہیں گولی کا نشان نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔(۲)

حق تعالیٰ کو تم سے بہت کام لینا ہے

گولی لگنے کے بعد حضرت والا کو محفوظ رہنے اور محض قدرے خون نکل آنے اور داڑھی مونچھ کے کچھ بال اڑ جانے پر بس ہوجانے کے ظاہری سبب کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) الامام الکبیر ص ۱۶۵/سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۱۴۷-۱۴۸
(۲) تذکرۃ الرشید

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گولی کا بے اثر رہ جانا حضرت الامام الکبیرؒ ہی کی کرامت تھی۔

میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے حضرت الامام الکبیرؒ کو وارستہ مزاج، آزاد اور جوشِ جہاد میں جان سے قطعاً بے پرواہ دیکھ کر جہاں مولانا منیر صاحبؒ کو ان کے پیچھے پیچھے بطور محافظ رہنے پر مامور کیا وہیں ایک تعویذ بھی دیا کہ اسے پگڑی میں رکھیں، بعض ثقات سے مسموع ہوا کہ حضرت حافظ ضامن صاحب شہیدؒ نے انگلی سے اپنا لعابِ دہن پیشانی پر لگا دیا تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت گنگوہیؒ کے تصرف کی طرف ایماء کیا ہے۔ بہر حال روایات مختلف ہیں ان میں نہ تعارض ہے نہ تضاد اور نہ ان میں سے کسی روایت کے انکار کی ضرورت۔

حاصل یہ نکلتا ہے کہ الامام الکبیرؒ کے بڑے، ہم عصر اور دوست سبھی ان کی طرف متوجہ اور ان کی طرف سے فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ خصوصیت سے وہ محفوظ رہیں کیوں کہ ان کے علم و فضل اور قوتِ باطنی سے آئندہ کے بہت سے دینی و علمی مہمات کی تکمیل محسوس کر رہے تھے۔

چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ کے ہجرت فرمانے کے وقت جب یہ دونوں خلفاء (الامام الکبیرؒ اور حضرت گنگوہیؒ) آخری طور پر ملنے کے لئے پنجلاسہ (پنجاب) پہنچے اور اصرار شروع کیا کہ حضرت ہم بھی آپ کے ساتھ اس ملک سے ہجرت کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں بھی ساتھ ہی لے چلئے تو شیخ نے فرمایا کہ نہیں تم ہندوستان ہی میں رہو، تم سے حق تعالیٰ کو بہت کچھ کام لینا ہے۔(۱)

گرفتاری کا وارنٹ

جب انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کرلیا، تب اطراف و جوانب کے باغیوں کی سرکوبی کی مہم بڑے پیمانے پر شروع کردی۔ انگریزوں کی فہرست میں تھانہ بھون بھی تھا، شاملی کی جنگ کے منصوبہ کرنے والوں اور لڑنے والوں کے خلاف انگریزوں نے وارنٹ جاری کیا، جن میں

(۱) سوانح قاسمی، ج ۲، حاشیہ ص ۱۶۱-۱۶۲

سرِ فہرست حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا منیر نانوتویؒ کا نام تھا، حاجی صاحبؒ تو مکۃ المکرّمہ ہجرت کرنے میں کامیاب ہوئے، حضرت گنگوہیؒ گرفتار ہوئے اور چھ ماہ بعد رہا ہوئے۔

محلّہ دیوان میں

انگریز پولیس حضرت نانوتویؒ کی تلاش وجستجو میں لگی رہی اور مسلسل تحقیق وتفتیش کرتی رہی، جہاں کی خبر ملتی، فوراً وہاں پہنچ جاتی مگر ہمیشہ ہی ناکامی ہاتھ لگتی۔

ان ہی دنوں مخبر نے خبر کیا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ محلّہ دیوان میں ہیں، پولیس نے مکان کا محاصرہ کرلیا، اتفاق سے چند منٹ قبل ہی آپ چھتہ مسجد میں چلے گئے تھے، پولیس ناکام لوٹی۔

ابھی تو یہیں تھے

مخبر نے دوبارہ اطلاع دی کہ ملزم اس وقت چھتہ مسجد میں ہے، پولیس افسر سپاہیوں کے ساتھ چھتہ مسجد پہنچا۔ حضرت نانوتویؒ صحن مسجد میں ٹہل رہے تھے، افسر نے حضرت ہی سے پوچھا: ''مولانا محمد قاسم یہاں ہیں؟'' حضرت کا ایک قدم اٹھنے اور آگے بڑھ گیا، فرمایا: ''ابھی تو یہیں تھے''

بقول غالبؔ

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ☆ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

افسر نے کہا کہ مخبر نے غلط اطلاع دی ہے۔

آنکھوں پر پردہ

پولیس افسر دیکھ بھال میں مصروف ہوا، حضرت نانوتویؒ نہایت اطمینان سے مسجد سے باہر نکل آئے اور پولیس کے گھیرے میں سے گزرتے ہوئے دوسری قریب کی مسجد شاہ رمزالدین کی طرف روانہ ہوگئے۔ پولیس افسر حضرت نانوتویؒ کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا کہ

''مولانا قاسم تو یہی معلوم ہوتے ہیں جو جارہے ہیں؟''

پولیس اُدھر چلی اور مسجد شاہ رمزالدین کا محاصرہ کرلیا، حضرت مسجد شاہ رمزالدین میں سے نکلے اور پولیس کے جتھے میں سے گزرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے۔

کپتان کے یہ کہنے کے باوجود کہ ''مولانا یہی معلوم ہوتے ہیں'' پولیس کے جتھے سے گزر جانے کی توجیہ بجز **فاغشیناھم فھم لایبصرون** (۱) کے کیا کیا جائے۔

الغرض یہ کہ پولیس افسران تلاشتے رہے مگر جن کی حفاظت آسمان سے ہورہی ہو ان کی گرفتاری کا کیا امکان تھا؟ الغرض پولیس کو چکر میں رکھا اور گرفتار نہ ہوئے۔

عام معافی کا اعلان

تلاشی کا یہ سلسلہ تقریباً انیس ماہ تک چلتا رہا، آپ کبھی دیوبند، کبھی نانوتہ، املیا، گم تھلا، لاڈوہ، پنج لاسہ، جمناپار، چکوالی، بوڑیا کی خاک چھانتے رہے، کبھی اطمینان وسکون کا ایک لمحہ میسر نہیں آیا۔ اسی دوران حضرت گنگوہیؒ گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، کبھی افواہ اڑی کہ پھانسی کا فیصلہ ہوگیا اور کبھی کہ کالا پانی بھیجنے کا فیصلہ ہوا اور ادھر دہلی سے ملک کے ممتاز علماء سربرآوردہ شخصیات کی پھانسی کی خبریں بھی مسلسل آتی رہتی تھیں۔

حضرت نانوتویؒ بھی اسی طرح انگریز کے ملزم تھے، ان پر کیا گزر رہی ہوگی، پھر انگلستان کی حکومت نے ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لی اور نومبر ۱۸۵۸ء میں عام معافی کا اعلان کردیا۔

............❖............

(۱) سورۂ یٰس آیت:۹

تیسرا باب

تحریک مدارس

تحریک مدارس اور خصوصاً تحریک دارالعلوم کی عظمت کا ادراک صحیح طور پر اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم اس ماحول اور پس منظر پر نظر ڈالیں۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے انقلاب ۱۸۵۷ء تک سو سال کی پے بہ پے شکست خوردگی اور برطانوی سامراج کے ظلم و جارحیت نے مسلمانوں کو اپنی لاچاری و بے بسی اور حرماں نصیبی پر خون کے آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد انگریزی حکومت کی انتقامی کارروائیوں نے مسلمانوں میں وہ خوف و ہراس پیدا کر دیا کہ رؤسا، امراء، جاگیردار اور علماء اپنے گھروں میں بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ چن چن کر مسلمان رؤسا کو یا تو پھانسی پر چڑھا دیا گیا یا کالا پانی بھیج دیا گیا۔ یہی لوگ دینی علوم کے مدارس قائم کرتے تھے اور مسلم معاشرہ کو صراط مستقیم سے بھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ اب وہ مدارس کھنڈر ہو گئے کیوں کہ اب ان کے اوقاف رہے نہ وہ لوگ رہے جو مدارس کے اخراجات پورے کرتے تھے۔''(۱)

دوسرے ۱۸۵۷ء کے پہلے ہی سے ایسٹ انڈیا کمپنی دہلی اور اس کے اطراف پر قابض ہو چکی تھی، اس لئے عیسائیت کی تبلیغ طاقت کے بل بوتے پر کی جاتی تھی۔ تمام سرکاری ملازمین کو یقین تھا کہ مستقبل میں ہر شخص کو بجبر و اکراہ عیسائی بنا دیا جائے گا۔ اس صورت حال نے مسلمانوں میں یہ خوف و ہراس پیدا کر دیا کہ حکومت کے ساتھ ساتھ اسلام بھی اس سرزمین سے رخصت ہو جائے گا۔ ساری صورت حال اس اندیشے کو تقویت پہنچاتی تھی۔ بس یہ وہ غم تھا جو حضرت نانوتویؒ کو کھائے جا رہا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

''یہ وہ زمانہ ہے جس میں ملک ہندوستان میں ایک ہنگامہ سخت برپا ہوا تھا، جس کو عوام الناس ''غدر'' کہتے ہیں۔ اکثر اکابر دین جنت الفردوس کو سدھارے اور بعض بعض جو

(۱) حیات، افکار، خدمات، ص......

پنجۂ ازل سے بچے اس ملک سے ہجرت فرما گئے۔ ہندوستان میں اسلام پر قریب قریب اسی طرح کا صدمہ عظیم واقع ہوا تھا، جیسے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف پر کل اسلام پر۔ مسلمانوں کی قلت، کفار کی کثرت، کفر کی شدت، بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ دین نسیاً منسیا ہو جائے۔''(۱)

ذہنی اور تہذیبی قتل

مسلمانوں کے جسمانی قتل کے ساتھ ذہنی اور تہذیبی قتل کا منصوبہ جس انداز میں بنایا گیا تھا اس کا اندازہ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی دارالعوام میں کی گئی اس تقریر سے ہو سکے گا:

''خداوند تعالیٰ نے یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے تا کہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہئے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہیں کرنا چاہئے۔''

انگریز ماہر تعلیم لارڈ میکالے کا وہ جملہ تو معروف ہی ہے:

''ہم ہندوستان میں ایسے مشن اسکول قائم کر رہے ہیں جس میں پڑھنے والے نسلاً تو ہندوستانی ہوں گے مگر مذاق اور رجحان کے اعتبار سے عیسائی ہوں گے۔''

لیکن لارڈ میکالے ۱۲/اکتوبر ۱۸۳۶ء کو جو خط ہندوستان سے لندن اپنی والدہ کے نام بھیجا تھا اس میں لکھا تھا کہ ''اگر میرے تعلیمی منصوبے پر پوری طرح عمل کیا گیا تو مجھے یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس سال کے بعد یہاں ایک بھی بت پرست غیر عیسائی نہیں رہے گا۔

اس زمانہ میں عیسائیت کی تبلیغ زور و شور پر چل رہی تھی۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ ''دیسی پادریوں کے علاوہ جن کا کوئی شمار نہیں نو سو صرف ولایتی پادری تھے جو تندہی کے ساتھ تبلیغ عیسائیت میں مصروف تھے۔''(۲)

(۱) سوانح قاسمی، جلد دوم، ص ۹۸

(۲) سیرت مولانا محمد علی مونگیری، ص ۴۲/ ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۲۵۲

ایسے وقت میں ایک سوال تو یہ تھا کہ کس طرح مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو قائم و برقرار رکھنے کی سعی کی جائے لیکن اس سے بڑا سوال مسلمانوں کے دینی وتہذیبی سرمائے اور متاعِ ایمان ویقین کی حفاظت و پاسبانی کا تھا۔حضرت نانوتویؒ نے دونوں سوالوں کو اپنے فکر و عمل کا موضوع بنایا، چنانچہ شاملی کا جہاد اسی پہلے سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش تھی، لیکن آپ کو خدا کی جانب سے عطا کردہ فکر وبصیرت نے دوسرے پہلو کو اصل مرکز توجہ بنانے کی طرف راغب کیا۔

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:
''حضرت نانوتویؒ کی عملی زندگی کے جس رخ کو دیکھیے وہ آفتاب و ماہتاب کو چشمک زنی کرتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن دارالعلوم دیوبند کی شکل میں جو کارنامہ ظاہر ہوا میں اسی کو حضرت نانوتویؒ کی زندگی کا نصب العین اور حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔ وہ شاملی کے محاذ پر تلوار چلاتے ہوئے ہوں یا میلۂ خدا شناسی میں عیسائیوں اور پادریوں سے مناظرہ کرتے ہوئے ہوں یا دیانند سرسوتی کے اعتراضات کے جواب میں تصنیف وتالیف میں مصروف ہوں۔ یہ سب حضرت نانوتویؒ کے کاروانِ زندگی کے خارزار وادیاں ہیں جن کو طے کرنا ان کے لئے حالات اور وقت کی مجبوری تھی، لیکن ان کی منزل اس سے کہیں آگے تھی، وہ منزل تھی برطانوی استعمار کی ظالمانہ وجابرانہ دور میں اسلام کا تحفظ وبقاء۔(۱)

حقیقت یہ ہے کہ احیائے سلطنت اسلامیہ کی جو جنگ شاملی کے میدان میں آپ نے اور آپ کے رفقاء نے ہاری تھی وہ جنگ زیادہ بھرپور اور وسیع طور پر آپ نے احیائے دین وملت کے میدان میں تاسیس دارالعلوم کے ذریعہ جیت لی۔

خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے مسلمان کشمکش کی زندگی گزار رہے تھے، کسی مخصوص فیصلہ پر پہنچنا ان کے لئے سخت دشوار تھا، اس لئے کہ ایک طرف حکومت ختم ہوئی اور دوسری طرف مذہب پر مسلسل یلغار۔ بقول سرسید''آنکھوں میں اندھیرا چھاتا چلا جاتا اور پاؤں تلے زمین نکلتی جاتی

(۱) حیات، افکار، خدمات، ص ۳۸۳

تھی'' مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ فرماتے ہیں:''اسی تفکر واضطراب کے پیش نظر حضرت الامام الکبیر پر جذب کے کیفیات تھے۔'' سر کے بال بڑھ گئے تھے، نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل، نہ کترے، نہ درست کئے۔ باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو اور مغموم رہتے تھے۔

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی ☆ تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی (۱)

دارالعلوم کی بنیاد

حضرت نانوتویؒ کی سسرال دیوبند کے محلّہ دیوان میں تھی، اس لئے اکثر یہاں تشریف آتی رہتی تھی۔ حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ اور حضرت حاجی عابد حسینؒ بھی اس سلسلے میں فکرمند تھے۔ حضرت والا ان کے ساتھ بیٹھ کر اکثر اسی درد کا تذکرہ کرتے اور اس کی دوا کی تلاش فرماتے۔ ان پاکیزہ اور قدسی صفات بزرگوں نے یہ طے فرمایا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے کے لئے ایک دینی وعلمی درسگاہ کا قیام ہونا چاہئے اور دہلی کے بجائے دیوبند میں ہونا چاہئے تاکہ انگریز اس عظیم مہم کا احساس نہ کرسکیں۔

اس تاریخی فیصلے کے بعد اس تاریخی، دینی مدرسہ کا قیام ۱۵رمحرم ۱۲۸۳ء مطابق ۳۰رمئی ۱۸۶۶ء کو چھتہ کی مسجد کے صحن میں درختِ انار کے سائے میں انتہائی سادگی کے ساتھ کسی رسمی تقریب یا نمائش کے بغیر عمل میں آیا، استاذ بھی محمود شاگرد بھی محمود۔ یہی شاگرد بعد میں ''شیخ الہند'' کے نام سے معروف ہوئے۔

دارالعلوم بقاء اسلام اور تحفظ علم کا ذریعہ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے مرشد اور جماعت دیوبند کے روحانی پیشوا حاجی امداداللہ مہاجر مکی کو مکہ مکرمہ میں اس مدرسہ کے قیام کی اطلاع دی گئی تو فرمایا کہ ''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے؟ یہ خبر نہیں کہ کتنی پریشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی

(۱) سوانح قاسمی، ج۱، ص۲۷۷

ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے“۔

اسلامی حکومت میں مدارس کے لئے حکومت کی جانب سے اوقاف مقرر ہوتے تھے۔ اسی طرح والیانِ ریاست اور امرائے حکومت بھی پوری فیاضی کے ساتھ مدارس کے اخراجات پوری فرماتے تھے۔ مگر اب نہ اسلامی حکومت رہی اور نہ ہی والیانِ ریاست۔ اس لئے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آئندہ متحدہ ہندوستان میں بچوں کی تعلیم کا نظم کیا ہو۔ یہ وہ سوال تھا جس سے عقلاء، دانشوران حیران و پریشان تھے لیکن قربان جائیے مرد درویش عارف باللہ حضرت نانوتویؒ پر کہ انہوں ایک نئی اور عجیب وغریب راہ نکالی کہ یہ نظام عوامی چندہ کا ہوگا، جس میں نہ حکومت کی مالی امداد شامل ہوگی اور نہ جاگیرداروں کی۔ ان کی دوررس نگاہ دیکھ رہی تھی کہ اسی صورت سے مدارس کو سرکاری اثرات سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے جو آپ کے اصول ہشت گانہ سے ظاہر ہے۔

اصول ہشت گانہ دارالعلوم

حضرت نے قیام دارالعلوم کے بعد اس ادارہ کے چلانے کے لئے جو دستورالعمل مقرر فرمائے جسے اصول ہشت گانہ کہتے ہیں، یہ اصول آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ تاریخ نے ثابت کردیا کہ ڈیڑھ صدی پہلے جس طرح یہ اصول نہایت اہم، مفید اور موثر تھے ٹھیک اسی طرح آج بھی ان کی افادیت اور اہمیت برقرار ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، ورنہ ہر اصول کو مستقلاً بیان کرتا۔ لیکن مجموعی طور پر عوامی چندہ، عوامی رابطہ، شورائی نظام، اقامتی نظام اور تعلیمی نظام وغیرہ جن چیزوں پر حضرت کی نگاہِ فراست گئی ہے اسے الہامی کہے جانے کے علاوہ اور کون سا نام دیا جاسکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر جیسے بالغ نظر تحریک خلافت کے زمانے میں جب دارالعلوم تشریف لائے اور اصول ہشت گانہ دیکھا تو بے ساختہ ان کی زبان سے یہ کلمات جاری ہوگئے: ”ان اصول کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو الہامی ہیں۔“ پھر فرمایا: ”حیرت ہے کہ سو برس دھکے کھا کر ہم آج اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اپنے اجتماعی اداروں کو انگریز کی کسی امداد پر ہرگز

معلق نہ رکھیں بلکہ خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوں۔ حیرت ہے کہ یہ بزرگ سو برس پہلے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔“(۱)

دارالعلوم کی عالم گیر شہرت

چند سالوں میں ہی دارالعلوم کی شہرت ملک سے نکل کر عالمگیر ہوگئی۔ سید محبوب رضوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”دارالعلوم کی عمر کا ابھی نواں سال ہی تھا کہ اس کی شہرت وعظمت کا آوازہ ہندوستان سے گذر کر ممالک اسلامیہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ قسطنطنیہ کا ایک موقر اخبار ”الجوائب“ اعزازی طور پر دارالعلوم میں آنے لگا۔ عالم اسلامی کا یہ ایک وقیع اخبار تھا۔“(۲)

دارالعلوم کی مقبولیت

اسی سال تھانہ بھون میں ”مدرسہ اسلامی“ کا آغاز ہوا اور انہوں نے دارالعلوم سے اپنے ادارہ کے الحاق کی درخواست کی جو روئیداد دارالعلوم میں مذکور ہے۔ اسی طرح دوسرے اداروں کے الحاق کا بھی تاریخ دارالعلوم سے پتہ چلتا ہے۔

۱۲۹۱ھ میں تھانہ بھون کے مدرسہ کا الحاق ہوا تھا، اس سال میں انبیٹھہ (ضلع سہارنپور) مظفر نگر اور گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) میں تین مدرسے بہ ایماء حضرت نانوتویؒ قائم ہوئے۔ تینوں کا دارالعلوم سے الحاق کیا گیا۔ اس لئے ان مدارس کے سالانہ امتحان کا دارالعلوم کی جانب سے انتظام کیا گیا۔ چنانچہ دارالعلوم کے اساتذہ نے ان مدارس میں پہنچ کر امتحانات لئے۔(۳)

---

(۱) سوانح قاسمی، ج۱، ص۴۸

(۲) تاریخ دارالعلوم، ج۱، ص۱۷۳

(۳) تاریخ دارالعلوم، ج۱، ص۱۸۶

’’مدرسہ اسلامی عربی دیوبند‘‘ سے ’’دارالعلوم دیوبند‘‘

دارالعلوم دیوبند اپنے قیام کے وقت مدرسہ اسلامی عربی دیوبند کے نام سے موسوم تھا، مگر جب ملک میں جابجا اس کی شاخیں قائم ہوگئیں اور عام طور پر اس کی تعلیم کو مستند مان لیا گیا اور علمی حلقوں میں اس کی مرکزیت تسلیم کی جانے لگی تو یکم صفر ۱۲۹۶ھ میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ: ’’اب اس مدرسہ کو دارالعلوم کہنا بجا ہے۔‘‘ (۱)

غرض تاسیس بزبان شیخ الہندؒ

دارالعلوم کی بنا کی غرض خود حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی زبانی سنئے: فرماتے ہیں ’’حضرت الاستاذ حضرت نانوتویؒ نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے (آخر میں ارشاد فرمایا) صرف تعلیم وتعلم، درس وتدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں لیکن اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔

چنانچہ حضرت نے احاطہ مدرسہ میں طلبہ کو فنون سپہ گری سکھلانے کا بندوبست بھی فرمایا تاکہ علم کے ساتھ سپاہیانہ اسپرٹ بھی ان میں قائم رہے۔ محکمہ قضا بھی قائم فرمایا تاکہ محکمہ شرعیہ کی خو بھی ان میں محفوظ رہے۔ ترکوں کی امداد کے لئے بھی مساعی فرمائیں، ایسی اجتماعی انجمنوں کی تائید بھی کی جو انگریزوں سے ملکی حقوق حاصل کرنے کے لئے قائم کی گئیں۔ (۲)

(۱) تاریخ دارالعلوم، ج۱، ص۱۸۸

(۲) تاریخ دارالعلوم، ج۱، ص۴۴

خدمات دارالعلوم

آج برصغیر کے طول وعرض میں دینی علوم سے واقف جتنی ہستیاں نظر آتی ہیں ان کی بڑی تعداد اسی دریائے علم سے سیراب ہوئیں اور بڑے بڑے علماء نے اسی عظیم الشان درسگاہ میں زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علمی خدمات کی گراں مائیگی میں برصغیر ہی میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ایک دو کے علاوہ کوئی تعلیم گاہ ایسی نہیں ہے جس نے ملت اسلامیہ کی اتنی وقیع، اہم دینی اور علمی خدمات انجام دی ہوں۔ علمائے دارالعلوم کے دینی، علمی، تبلیغی اور تصنیفی کارناموں کا برصغیر ہی میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بارہا اعتراف کیا گیا ہے، خصوصاً رشد وہدایت اور تدریس وتبلیغ کے میدانوں میں یہ سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ دارالعلوم کی انہی دینی، علمی اور فکری سرگرمیوں نے اسے دنیائے اسلام کی آنکھوں کا مرکز بنا دیا ہے اور عجیب تر بات یہ ہے کہ دارالعلوم نے یہ تمام ترقیاں حکومت سے بے نیاز رہ کر کیں۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت صاف طور پر نظر آتی ہے کہ یہ قدیم طرز کی صرف ایک درسگاہ ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت احیائے اسلام اور قیام ملت کی ایک عظیم الشان تحریک ہے۔

تحریک دیوبند کے نمائندے

اس موقع پر اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ تحریک دیوبند کو جن علماء دیوبند نے مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں سے پروان چڑھایا اور آگے بڑھایا ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حکیم الاسلام مولانا محمد طیب، مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا سید منت اللہ رحمانی، مولانا محمد منظور نعمانی

،مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سید محمد میاں دیوبندی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔مشاہیر علماء دیوبند اوران کے کارناموں پرمختلف کتابیں موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ان کا کام اور پیغام سامنے آسکتا ہے۔

تحریک دیوبند کا فیض اور اس کی برکت یہ بھی رہی ہے کہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں ہندوستان کو اسپین بننے نہیں دیا۔اور یہ مسلمان ہندوستان میں اسلامی ورثہ سے جڑے رہے۔

دارالعلوم ام المدارس ہی نہیں بلکہ ام التحریکات ہے

اگر بغور دیکھا جائے تو ہندوستان میں دیوبند کے اس مدرسہ کی بنیادی حیثیت جو دارالعلوم کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے ام المدارس کی ہے تو ۱۸۵۷ء کے بعد جتنی دینی، تعلیمی، ملی، جماعتی اور رفاہی تحریکیں ہندوستان سے اٹھیں ان سب میں تحریک دیوبند کا حصہ ہے۔اس اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کو ام المدارس ہی نہیں بلکہ ام التحریکات بھی کہا جاسکتا ہے۔جاننے والے جانتے ہیں کہ تحریک علی گڑھ، تحریک ندوہ اور تحریک جامعہ ملیہ پر بھی تحریک دیوبند کے اثرات رہے ہیں۔خلافت، امارت شرعیہ، ریشمی رومال، جمعیۃ علماء، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور اس طرح کی دوسری تحریکیں جو ہندوستان سے اٹھیں یا بعض تحریکیں جو عالم اسلام میں برپا ہوئیں ان میں تحریک دیوبند کی کسی نہ کسی طرح شمولیت محسوس ہوتی ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت اختصار ہے، اس لئے تاریخی شواہد کو جمع کرکے اس کی توثیق وتصدیق ضروری نہیں سمجھ رہا ہوں۔تاہم باخبر حضرات ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں تحریک دیوبند کی عظمت، اہمیت، وسعت اور ہمہ گیری سے بے خبر نہیں ہیں۔دارالعلوم دیوبند کے فضلاء ملک اور بیرون ملک میں جس حیثیت اور شان کے ساتھ رہے وہ تحریک دیوبند کے نمائندہ بن کر رہے۔معلوم نہیں ڈاکٹر محمد اقبال نے کس پس منظر میں یہ شعر کہا تھا مگر تحریک دیوبند اوراس کے اثرات اور فیوض وبرکات پر یہ شعر پورے طور پر منطبق ہو رہا ہے:

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری (۱)

دیگر مدارس کا قیام

حضرت نانوتویؒ قیام دارالعلوم کے بعد چین سے نہ بیٹھے بلکہ اطراف واکناف میں مختلف مدارس بھی قائم فرمائے جس کی برکت سے صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ برصغیر میں خصوصاً مدارس کے جال بچھ گئے۔جو مدارس ملت ہندیہ کے وجود کی ضمانت بنی ہوئی ہیں اور عموماً عالم اسلام کے مختلف ملکوں میں آج دارالعلوم ہی کے نصاب کے مطابق مدارس اسلامیہ قائم ہیں جو دین اسلام کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔حضرت نانوتویؒ کی ایما پر جن مدارس کا قیام عمل میں آیا جن کی تفصیلات روئیداد دارالعلوم میں ملتی ہیں چند مدارس کا اجمالاً تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مدرسہ اسلامی تھانہ بھون

(اس کا تذکرہ پہلے بھی ضمناً آچکا ہے) تھانہ بھون میں یہ مدرسہ حافظ عبدالرزاق صاحب کے اہتمام میں شروع ہوا اور اس کے پہلے مدرس مولانا فتح محمد صاحب ہوئے اور اس ادارہ کا الحاق دارالعلوم سے کرلیا گیا۔

(۲) مدرسہ اسلامی میرٹھ

شہر میرٹھ میں حضرت نانوتویؒ کے ایک عقیدت مند مولوی محمد ہاشم صاحب رئیس میرٹھ نے یہ مدرسہ غریب مسلمانوں کے چندہ سے آغاز فرمایا اور اس کے پہلے مدرس مولوی ناظر حسن ہوئے جو دارالعلوم ہی کے فارغین میں تھے۔

(۳) مدرسہ اسلامی گلاؤٹھی

قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلندشہر میں ایک مدرسہ حضرت نانوتویؒ کی ہدایت کے مطابق وہاں

(۱) (حیات، افکار، خدمات، ص۳۸۱)

کے معتبر، دین دار رئیس منشی سید مہربان علی صاحب (جو دارالعلوم کے بڑے معاونین میں تھے) نے قائم فرمایا اور ابتداءً دو مدرس کا تقرر فرمایا جو دونوں دارالعلوم دیوبند کے ہی فارغ التحصیل تھے اور حسن اتفاق دونوں ہی کا نام مولوی عبداللہ تھا۔

(۴) مدرسہ اسلامی دان پور

دان پور بھی ضلع بلند شہر ہی کا ایک قصبہ ہے، یہاں کے رئیس نواب معشوق علی خاں نے حضرت کے حکم سے ایک مدرسہ اسلامی کی بنیاد رکھی جس کا نام ''وزیر العلوم'' رکھا اور طلبہ کی راحت رسانی کا معقول نظم کیا۔ مدرسہ کے اخراجات کے لئے کئی گاؤں وقف کر دیئے۔ اس مدرسہ میں ایک زمانہ تک دورۂ حدیث تک تعلیم کا انتظام رہا ہے۔

(۵) مدرسہ اسلامی مرادآباد

شہر مرادآباد میں بھی حسب ایماء حضرت نانوتویؒ غریب مسلمانوں کے چندہ سے ایک مدرسہ شروع ہوا اور اس کے پہلے استاذ حضرت نانوتویؒ کے شاگرد رشید مولانا احمد حسن محدث مقرر ہوئے۔ آج تک ادارہ قائم ہے جو جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کے نام سے معروف ہے اور ملک کے ممتاز اداروں میں شامل ہے۔

............❖............

چوتھا باب

تحریک عقد بیوگان

ہندوستان میں شرافت ونجابت کا معیار چوں کہ عموماً یہی قرار پا گیا تھا کہ بیوہ ہونے بعد کسی دوسرے مرد کا منہ عورت نہ دیکھے، اس لئے مسلمانوں نے بھی اپنی شرافت کا معیار اسی کو ٹھہرالیا، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانانِ ہند کو چونکاتے ہوئے منجملہ دوسری باتوں کے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ:

''ہندوؤں کی ایک بری عادت ہے کہ جب کسی کا شوہر مر جاتا ہے تو وہ عورت دوسرا نکاح نہیں کرتی، یہ عادتِ قبیحہ عرب میں بالکل نہ تھی نہ حضور اکرم ﷺ سے پہلے اور نہ ان کے زمانے میں اور نہ ان کے بعد۔''

ان تمہیدی امور کے بعد شاہ صاحبؒ مسلمانانِ ہند کو وصیت کرنا چاہتے ہیں مگر رسم و رواج نے مسلمانوں کے اندر بھی اس بری عادت کو اس حد تک مستحکم کر دیا تھا کہ بجائے وصیت کے بے ساختہ اس موقع پر وہ دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کچھ کہنے سننے کے بجائے فرماتے ہیں ''خدا تعالیٰ رحمت کند برآں کس کہ ایں عادت شنیعہ را متلاشی سازد''

جس سے بھی شاہ صاحب کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے، نیز آگے ان ہی کے ان فقروں سے کہ ''اگر عام مسلمانوں سے اس رسم کا ازالہ ممکن نہ ہو تو چاہئے کہ خود اپنے کنبہ میں عرب کی اس عادت کو جاری کیا جائے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس عادت کو چاہئے کہ دل سے برا سمجھا جائے اور اس کا دشمن بن جانا چاہئے کہ میری بات کے انسداد کا یہی آخری درجہ ہے۔'' (۱)

مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''میں نے شاہ صاحبؒ کی کتاب سے ان کی پوری عبارت اسی لئے نقل کی ہے کہ اس رسم بد کی گرفت کی سختی جس حد تک ہندوستان کے مسلمانوں میں پہنچ چکی تھی، اس کو ان کے مذکورہ

(۱) وصیت نامہ، ص ۱۳/سوانح قاسمی، ج دوم، ص ۷

بالا الفاظ سے ہم سمجھ سکیں، ان کا دل تڑپ رہا تھا، چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو اس کے ترک پر آمادہ کریں، لیکن حالات ان کے سامنے ایسے تھے کہ بظاہر کامیابی سے کچھ نا امید نظر آتے ہیں، اسی لئے آخر میں دل سے برا جاننے کی آخری تدبیر کے استعمال تک وہ اتر آئے ہیں۔

عقد بیوگان اور خانوادۂ ولی اللہی

مولانا اسماعیل شہید جیسا کہ معلوم ہے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے ہیں، مولانا شہید کی ہمشیرہ کا عقد گھر ہی میں مولانا رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے مولوی عبدالرحمٰن صاحب سے ہوا تھا، لیکن کچھ ہی دن بعد مولوی عبدالرحمٰن صاحب کا انتقال ہو گیا اور مولانا اسماعیل شہید کی ہمشیرہ صاحبہ بیوہ ہوگئیں۔ اب سنئے خود شاہ ولی اللہ کے گھرانے کا یہ قصہ ہے، مولانا اسماعیل کا یہ بیان امیر شاہ خان نے نقل کیا ہے۔ کہتے تھے کہ:

''جب میں اپنی بہن کو مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتا تھا، تو نکاح ثانی کے فضائل قصداً چھوڑ دیتا تھا کہ مبادا میری بہن کو ترغیب ہو اور وہ نکاح کرلے۔''(۱)

عقد بیوگان کے مسئلہ میں خانوادہ ولی اللہی کے احساسات کی نزاکتوں کا یہ حال تھا، تو اسی سے سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کی ذہنیت اس باب میں کیا رہی ہوگی یا کیا ہو سکتی تھی۔

شاہ صاحبؒ کی دلی دعاء

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کراہتے ہوئے دل کی دعا قبول ہوئی اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اس رحمت کے مستحق ہوئے، جس کی دعا شاہ صاحب نے مانگی تھی، یہ قصہ کافی طویل ہے۔ سیرت سید احمد شہید میں اس کی تفصیلات پڑھئے، امیر شاہ خان کہا کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید سے کسی نے پوچھا کہ اپنے چچا شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے زیادہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے گرویدگی کی وجہ آپ کے لئے کیا

(۱) ص ۶۹، ارواح

ہوئی؟ تو جواب میں اسی کا حوالہ دیا کہ ان کی صحبت میں یہ جرأت مجھ میں پیدا ہوئی کہ اپنی بیوہ بہن کا عقد زور دے کر میں نے خود کرا دیا۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کا دلچسپ واقعہ

جس کی تفصیل خاں صاحب ہی یہ بیان کرتے تھے کہ پھلت میں ''عقد بیوگان'' کی طرف مسلمانوں کو ایک دن برسر منبر مولانا اسماعیل شہید توجہ دلا رہے تھے کہ مجمع میں کسی نے عرض کیا میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، مولانا شہید سمجھ گئے اور منبر سے اتر گئے۔ فرمایا کہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو پھر پوچھنا، یہ کہتے ہوئے سیدھے پھلت سے دہلی پہنچے اور اپنی بیوہ بہن کے قدموں پر عمامہ ڈال دیا اور گڑگڑا کر عرض کرنے لگے:

''تم چاہو، تو میں وعظ کہہ سکتا ہوں، ورنہ نہیں کہہ سکتا۔''

وہ بے چاری حیران تھیں کہ قصہ کیا ہے تب کھلے کہ تمہارے عقد نہ کرنے کی وجہ سے میری دعوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مولانا شہید کی ہمشیرہ صاحبہ حالاں کہ بیمار تھیں اور نکاح کی صلاحیت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھیں، لیکن بھائی کے اصرار سے راضی ہوگئیں اور پھلت ہی کے مشہور عالم سید شہید کے رفیق مخلص مولانا عبدالحئی سے ان کا نکاح کر دیا۔

واللہ اعلم بالصواب امیر شاہ صاحب کو یہ علم تھا یا واقعہ یہی تھا کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں ''مولوی اسماعیل صاحب کی بہن کا نکاح ثانی سب سے پہلا نکاح ثانی تھا۔''(۱)

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقد بیوگان کی تحریک کا آغاز حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کی طرف سے ملک میں جب شروع ہوا تو اس سلسلہ میں مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ صاحبہ کا عقد ثانی پہلا عقد ثانی تھا، گویا اس رسم بد کے ازالہ کے سلسلے میں یہ پہلا تاریخی نمونہ تھا۔

ارواحِ ثلاثہ وغیرہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر علماء کا ایک طبقہ عقد بیوگان کی کوششوں میں منہمک اور مشغول ہو گیا تھا کوئی

(۱) سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۹

بے چارے مولوی عبدالرحیم صاحب تھے جو ''رانڈوں کی شادی والے'' مولوی کے نام ہی سے مشہور ہو گئے تھے۔(۱)

اس سلسلہ میں مولوی محبوب علی دہلوی مرحوم کا نام بھی خاص طور پر لیا جاتا ہے مگر بایں ہمہ نسلہا نسل کی راسخ رسم جو دلوں کی گہرائیوں میں پشتہا پشت سے جاگزیں تھی، اس کی جڑوں کا نکالنا آسان نہ تھا اور تو اور یہی دیوبند کا قصبہ جہاں آج دارالعلوم ہے، اسی کا ایک قصہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی سلسلہ میں نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ پھلت کے ایک عالم باعمل مولانا وحید الدین مرحوم تھے، وعظ ان کا عام طور پر مقبول تھا، خصوصیت کے ساتھ دیوبند کے شیخ زادوں میں غیر معمولی احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، ان کی اصلاحی باتیں عموماً لوگ مان لیتے تھے، ایک دن دیوبند ہی میں وعظ کہتے ہوئے مولوی وحید الدین بے چارے نے عقد بیوگان کے مسئلہ کا ذکر بھی چھیڑ دیا، کہتے ہیں کہ ابھی تمہید ہی شروع ہوئی تھی کہ مجلس سے قصبہ کے ایک رئیس شیخ زادے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور منبر کے پاس بے ساختہ دوڑتے ہوئے پہنچے، مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور برسر مجلس ڈانٹتے ہوئے بولے کہ:

''بس مولوی صاحب اس مضمون کو مت بیان کرو۔''

بیان کیا ہے کہ بے چارے مولوی صاحب مرحوم دم بخود ہو کر رہ گئے، کیوں کہ مجلس میں کسی کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ شیخ صاحب یہ کیا کر رہے ہو، گویا ساری مجلس شیخ صاحب ہی کی موید اور ہم نوا تھی۔

بہر حال یہ اور اس قسم کے بیسیوں واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''عقد بیوگان'' کی اس تحریک کی مخالفت میں بدبخت مسلمانوں کی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا تھا، حتی کہ سید احمد شہیدؒ کی جہادی مہم کی ناکامی تک میں معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ دوسرے اسباب کے ''عقد بیوگان'' کے سلسلہ کی کشمکش کو بھی دخل تھا۔ تاہم حضرت شاہ ولی اللہؒ کی دعاء اندر ہی اندر اپنا کام کرتی چلی جاتی تھی، سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے بعد جیسا کہ ہمارے مصنف امام

(۱) ارواح ثلاثہ، ص ۷۱

کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اضلاع سہارنپور و مظفر نگر وغیرہ میں سیدنا الامام الکبیر کے استاذ حضرت مولانا مملوک علیؒ اور کاندھلہ کے مشہور بزرگ مولانا مظفر حسینؒ حسن تدبیر کے ساتھ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مشغول رہے، مولانا مظفر حسین کاندھلوی کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہوئے وہی فرماتے ہیں کہ:

''بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اولاً ان ہی سے ہوئی اور والد مرحوم (مولانا مملوک علی صاحب) نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجرا فرمایا۔''(۱)

اور ان بزرگوں کے بعد جیسا کہ مصنف امام ہی نے اطلاع دی کہ ''ان دونوں بزرگوں (مولانا مظفر حسین و مولانا مملوک علی) کے قدم قدم حضرت مولانا (سیدنا الامام الکبیر) نے اس کو پورا شائع کیا۔(۲)

ان کی اس تاریخی شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ''خدا رحمت کند برآں کس کہ ایں عادت شنیعہ را متلاشی سازد'' اس ولی اللّٰہی دعا اور تمنا کی تکمیل بالآخر سیدنا الامام الکبیرؒ کی ذات بابرکات پر ہوئی۔ ''اس کو پورا شائع کیا'' ہمارے مصنف امام کی یہ شہادت تو اجمالی الفاظ میں ادا ہوئی ہے، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس اجمال کی تھوڑی تفصیل بھی کی ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ:

''نکاح ثانی بیوگان کو ایسا برا اور سخت عیب سمجھتے تھے کہ کرنا تو کرنا، اگر کوئی نام بھی لے لیتا تھا، تو مارنے مرنے کو مستعد ہو جاتے تھے۔''

ان ہی حالات میں ان کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیرؒ نے اپنے استاذ اور بزرگوں کے نقش قدم پر اس سلسلہ میں جدوجہد شروع کی، مواعظ و خطبات میں مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلانے لگے، لکھا ہے کہ:

''اوّل اوّل لوگوں کے کانوں میں جو نئی بات پڑی، تو چونکے اور گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔''

(۱) ص ۳۱

(۲) ص ۳۱

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے:

''اور بعض بعض نے خلاف میں منصوبے گانٹھے''

واللہ اعلم بالصواب یہ کون لوگ تھے اور اضلاع سہارنپور ومظفر نگر کے کن مقامات کے رہنے والے تھے، بظاہر دیوبند اور نانوتہ ہی کے باشندے معلوم ہوتے ہیں، مگر باوجود ان منصوبوں کے حضرت والا نے پوری استقامت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ مردوں کو سیدنا الامام الکبیرؒ نے چمکار چمکار کر مانوس بنایا لیکن ظاہر ہے کہ مردوں کے خیال میں تبدیلی پیدا بھی ہوئی تو کیا رسم ورواج کی غیر معمولی تاثیری قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ مردوں سے زیادہ خود عورتوں میں ''عقد ثانی'' کا خیال عفت وناموس کے لئے داغ بن چکا تھا، کسی عورت کے لئے اس کو سوچنا بھی اس کے نزدیک گناہ اور پاپ ہوتا تھا، مردوں کے بعد ضرورت تھی کہ عورتوں کے اندر رسم ورواج کے پیدا کئے ہوئے غلط جذبات اور جھوٹے احساسات کا قلع قمع کیا جائے اور یہی حکیمانہ تدبیر حضرت والا نے اختیار کی۔ مردوں کی مجالس کی تقریروں کے بعد اسی کتاب میں لکھا ہے کہ:

''نوبت یہاں تک پہنچی کہ مستورات میں وعظ ہونے لگے اور بیواؤں کے کانوں تک مضامین نکاح ثانی پہنچنے لگے۔''

اور اس سلسلہ میں جدوجہد آپ کی اس نقطہ تک بقول ان کے پہنچ گئی کہ:

''کوئی بیوہ اور وارث بیوہ ایسا نہ رہا جس کے کان تک نکاح ثانی کے فضائل نہ پہنچے ہوں۔''

الغرض آپ کی تبلیغ کا جو میدان تھا، اس میں اندر ہو یا باہر اپنی آواز آپ نے پہنچادی اور یہ کوشش تو قول اور گفتار کے سلسلہ میں تھی، لیکن آپ سن چکے کہ کہنے سے پہلے جس کی عادت بھی تھی کہ جو بات دوسروں سے کہی جائے پہلے خود کر کے دکھلا دی جائے۔ خصوصاً اس مسئلہ میں نفسیاتی طور پر اس کی زیادہ ضرورت تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ:

''جب مولانا نے اول اس کام کا بیڑہ اٹھایا تو کسی کو اس کی امید نہ تھی کہ یہ کام چل

نکلے گا۔''

پھر وہی اطلاع دیتے ہیں کہ چل نکلنے کے لئے ترکیب یہ اختیار کی گئی کہ وہی دیوان جی حاجی محمد یٰسین مرحوم، حضرت والا جن کو اپنا ہاتھ پاؤں کہتے تھے اور وہ برادری کے غیر معمولی محبت واخلاص نے جنہیں آپ کے گھر کا رکن خصوصی بنا دیا تھا، ان کی ایک بیوہ بہن تھیں، حضرت ان ہی کو آمادہ کیا کہ اپنی بہن کا عقد ثانی کردیں، لکھا ہے کہ:

''اول میاں محمد یٰسین صاحب کی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح ثانی ہوا۔''

اور صرف ہمشیرہ ہی نہیں بلکہ دوسری جگہ وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حاجی یٰسین مرحوم کی ایک بھانجی بیوہ کا نکاح ثانی بھی کرایا۔''

سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ حاجی محمد یٰسین مرحوم

''چوں کہ اپنی قوم میں عالی نسب ہیں، اس لئے ان کا یہ فعل زیادہ موثر ہوا۔''

اور دیوان جی ہی کے پیش کئے ہوئے عملی نمونوں کو کافی قرار نہیں دیا گیا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب عقد بیوگان کی تحریک زور وشور کے ساتھ جاری تھی، یہ اتفاقی واقعہ پیش آیا کہ سیدنا الامام الکبیرؒ کی ''ہمشیرہ اسی عرصہ میں بیوہ ہوگئیں۔''

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ آپ کی یہ بیوہ ہوجانے والی ہمشیرہ صاحبہ حالاں کہ اولاد والی تھیں، لیکن منجانب اللہ اپنے گھر کی طرف سے ایک عملی مثال پیش کرنے کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کے سامنے آگیا اور ٹھیک جیسے حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنی بہن کا عقد کر کے قول کو فعل کے مطابق کر کے دکھایا تھا، سیدنا الامام الکبیرؒ کے سامنے آگیا اور ٹھیک جیسے حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنی بہن کا عقد کر کے قول کو فعل کے مطابق کر کے دکھایا تھا۔ سیدنا الامام الکبیرؒ نے بھی جو کچھ دوسروں سے فرمارہے تھے خود کر کے دکھایا اور آل واولاد رکھنے والی اپنی بہن کو عقد ثانی کرنے پر آپ نے راضی فرمالیا اور ان کا نکاح ہوگیا۔

اس کا تفصیلی واقعہ حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

''جو میں نے اپنے بزرگوں سے سے بکرات ومرات سنا ہے بعینہ اسی انداز کا ہے جو

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ (محلّہ) دیوان (دیوبند) میں نکاح بیوگان کا وعظ فرمارہے تھے، اثناء وعظ میں شیوخ میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ حضرت انداز سے سمجھ گئے کہ وہ بطور اعتراض میری بہن کی بیوگی اور عدم نکاح کا ذکر کریں گے، فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہریں، مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں، یہ کہہ کر حضرت وعظ کی چوکی سے اترے اور گھر میں تشریف لے گئے، مجلس اپنی جگہ جمی رہی، گھر میں پہنچ کر اپنی بیوہ بہن سے جو عمر میں بڑی تھیں اور کافی ضعیف ہو چکی تھیں، پیر پکڑ کر لجاجت سے عرض کیا کہ آپ کی ایک ہمت سے ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے اور میں احیاءِ سنت کے قابل ہوسکتا ہوں بہن نے گھبرا کر کہا کہ بھائی ایسی کیا بات ہے، میرے پیر تو چھوڑ دو، میں کہاں اس قابل کہ کسی سنت رسول کے احیاء کا سبب بنوں؟ فرمایا کہ آپ نکاح فرمالیں، اس پر بہن نے کہا کہ بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میں ضعیف ہو چکی ہوں، سر سفید ہو چکا ہے، نکاح کی عمر نہیں ہے، فرمایا یہ سب صحیح ہے مگر یہ نکاح محض عقد بیوگان کی سنت کے احیاء کے لئے ہوگا، کسی طبعی ضرورت کی بناء پر نہیں۔ اُس پر بہن راضی ہوگئیں، اسی وقت گھر ہی میں حضرت نے نکاح پڑھا اور نکاح سے فارغ ہوتے ہی باہر تشریف لائے۔ مجلس وعظ اسی طرح جمی ہوئی تھی۔ حضرت نے بقیہ وعظ شروع فرمایا۔ وہ معترض تو اعتراض کی ٹھانے ہوئے تھے، پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ تو نکاح بیوگان کا وعظ فرمارہے ہیں اور آپ ہی کے گھر میں آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہوئی ہے۔ فرمایا کون کہتا ہے کہ وہ بیٹھی ہیں، ان کے نکاح کے گواہ تو اس مجلس میں بھی موجود ہیں، چنانچہ گواہوں نے گواہی دی کہ ان کا نکاح تو ہماری موجودگی میں ہوا ہے، اس پر تمام جلسہ متاثر ہوا اور اسی مجلس میں تقریباً پچاس ساٹھ نکاح ہوئے اور پھر یہ تحریک نہایت قوت سے آگے چلی۔ (۱)

ظاہر ہے کہ جہاں گفتار، کردار کا قالب ان شکلوں میں اختیار کررہا تھا، وہاں اگر یہ صورت پیش آئی ہو، جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ:

(۱) حاشیہ سوانح قاسمی، جلد ۲، ص ۱۴

"پھر تو اس دھوم دھام سے نکاح (ثانی) ہونے لگے، جیسے کنواری لڑکیوں کے۔"

ہمارے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق جو یہ خبر دی کہ "عقد بیوگان کی عام اشاعت ان ہی کی بدولت ہوئی، اس کا مطلب یہی تھا کہ عزت وناموس کے منافی بیوہ عورتوں کے عقد کو جو عموماً سمجھا جاتا تھا، اس غلط ظالمانہ خیال کا ازالہ ہوگیا، بقول مصنف سوانح مخطوطہ:

"یہ تو نہیں کہ سب بیواؤں کا نکاح ہوگیا، مگر جو روگ دل کے اندر تھا کہ نکاح ثانی کو نک کٹی اور شرافت کے خلاف سمجھتے تھے وہ دور ہوگیا اور عیب نہ رہا۔" (۱)

اس میں شک نہیں کہ بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے زیادہ تر اس کا تعلق اسی علاقہ کے مسلمانوں سے ہے، جس میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی تحریک جاری کی تھی، لیکن دارالعلوم دیوبند کے قائم ہوجانے کے بعد سارے ہندوستان میں پڑھ پڑھ کر علماء جو پھیلے آگے ان کی اور ان کے زیر اثر شخصیتوں کی بدولت ہمارے زمانے تک عقد بیوگان کے رواج میں کافی وسعت پیدا ہو چکی ہے۔ (۲)

میرا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس رسم بد کے ازالہ میں جو کچھ کام ہوا، براہِ راست دارالعلوم دیوبند اور ان کے ہم خیالوں ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، بلکہ حضرت سید شہید کے ماننے والوں میں ایک طبقہ اہل حدیث کا جو پیدا ہوگیا تھا اس کی طرف سے بھی کافی جدوجہد ہوئی۔ مولانا حالی کی مشہور نظم "بیوہ کی مناجات" وغیرہ کا بھی کافی اثر پڑا، عجیب بات ہے کہ مسلمان تو مسلمان پچھلے دنوں خود ہندوؤں میں بعض لوگ "بدھوابواہ" کی تحریک کو لے کر کھڑے ہوئے اور گو مسلمانوں کی جیسی کامیابی تو ان کو نہیں ہوئی لیکن قدرت کا پھر بھی یہ تماشا ہی ہے کہ جن کو دیکھ کر مسلمان اس مسئلہ میں بگڑے تھے خود ان ہی میں اس ظالمانہ رسم کے خلاف تجویزیں سوچی جانے لگیں اور تھوڑا بہت عمل بھی ہونے لگا۔ بہرحال اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر حلقوں کا بھی اس اصلاح میں غیر معمولی حصہ ہے۔) (۳)

(۱) ص ۴۴۔ (۲) سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۱۵

(۳) حاشیہ سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۱۵

پانچواں باب

لڑکیوں کے وراثت کی تحریک

حضرت نانوتویؒ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے، نام نہاد شرفاء نے اپنی شرافت کی نمائش کے لئے ہندوؤں سے بہت سی رسمیں مستعار لے رکھی تھیں، ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کا عزم بالجزم کئے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک اہل علم کو ان کے خط کے جواب میں ہندوؤں کی رسموں کو اختیار کر لینے پر کتنے درد سے یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں ''کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے کو بھلا کہہ سکتے ہیں۔''

مسلمان جاگیرداروں، زمین داروں اور مالداروں میں ہندوؤں سے ایک اور رسم بھی لے رکھی تھی، ہندو مذہب میں لڑکیوں کو حق وراثت حاصل نہیں ہے۔ مسلمانوں نے بھی اسلام کے بیان کردہ احکامِ وراثت کو ٹھکرا کر ہندو مذہب کی اس غلطی کو خود اپنے یہاں رائج کر لیا تھا اور پوری سختی سے اس پر کاربند تھے، شرعی قانون وراثت کی کھلم کھلا مخالفت کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ لڑکیوں کو حق وراثت حاصل نہیں ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی مجلس میں ایک مرتبہ قصبہ جلال آباد ضلع مظفرنگر کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ ''وہاں لڑکیوں کا حق جو شریعت نے مقرر کر دیا ہے نہیں دیا جاتا ہے۔ اس لئے جلال آباد کے مسلمانوں کی جائیداد کا خریدنا جائز نہیں ہے۔''

یہ روایت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی قصص الاکابر میں موجود ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت والا کے اس فتویٰ کی بدولت اپنے شرعی حصہ کے پانے میں کتنی غریب لڑکیاں کامیاب ہوئی ہوں گی، پھر آپ نے شریعت کی اس خلاف ورزی کو مٹانے کی مہم چلائی اور مظفرنگر، سہارنپور اور مغربی اضلاع سے غیر شرعی رسم اور لڑکیوں پر ہونیوالے ظلم کو معاشرہ سے ختم کیا۔

............❖............

(۱) حیات اور کارنامے، ص۱۷۱،۲۷، سوانح قاسمی، ج۲، ص۱۷

چھٹا باب

ردشیعیت کی تحریک

سنیوں کے بعد شیعہ ہی اس کے مستحق تھے کہ ان کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے اور اس سلسلہ میں جو کچھ آپ سے ہوسکتا تھا کرتے رہے اور کتاب بھی ہدیۃ الشیعہ نامی تصنیف فرمائی۔

شیعوں کی مجلس میں تبلیغ

پورقاضی کے شیعوں کے مطابق مولانا طاہر صاحبؒ نے اپنے والد مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ الامام الکبیر جس زمانے میں پورقاضی پہنچے تھے تو اتفاقاً یہ محرم کا مہینہ تھا، الامام الکبیر کی تشریف آوری کی خبر پورقاضی کے شیعوں کو ہوئی تو ایک وفد ان کے سربرآوردوں کا خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور یہ خواہش کی کہ ماتم کی مجلس میں شریک ہوکر پورقاضی کے شیعوں کو ممنون فرمایا جائے۔

خلافِ توقع بجائے انکار کے الامام الکبیر نے فرمایا کہ میری ایک شرط بھی منظور کی جائے تو میں اس مجلس میں شریک ہوسکتا ہوں، شرط یہ تھی کہ اسی مجلس میں ''جو کچھ'' عرض کروں اسے سن لیں۔ وفد نے اس شرط کو منظور کر لیا مگر اسی کے ساتھ ان کی طرف سے مزید مطالبہ پیش ہوا کہ آپ کے وعظ سے پہلے مجلس ہوگی، اس میں حلوہ بھی تقسیم ہوتا ہے وہ بھی آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔

آپ نے اس اضافہ کو بھی مان لیا اور حسب وعدہ ماتم کی مجلس میں حاضر بھی ہوئے، حلوہ جو دیا گیا اسے بھی لے لیا، جب شیعوں کی پیش کردہ شرائط پوری ہوگئیں تب ماتم کی اسی مجلس میں الامام الکبیر نے کھڑے ہوکر رسول اللہ ﷺ کی مشہور وصیت **ترکت فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی**(۱) پر ایک مفصل ومبسوط تقریر فرمائی۔

الغرض ماتم کی مجلس بجائے ماتم کے تبلیغ کی مجلس بن گئی اور اس وعظ کے بعد بہت

(۱) السنن الکبریٰ، ج:۷، ص:۴۳۷۔

سے لوگوں نے توبہ کی۔ یعنی کہ شیعی عقائد سے تائب ہو کر لوگ سنی بن گئے۔ (۱)

تعزیہ داری کے خلاف سر دینے کا اعلان

ایک قصہ دیوبند کے حاجی محمد یٰسین دیوان جی کا ہے، شمار اُن کا دیوبند کے سر برآوردہ شیوخ میں تھا۔ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ''اُن کے خاندان پر رفض کا رنگ چڑھا ہوا تھا، ان کے یہاں تعزیہ داری مشہور تھی۔''

بہر حال الامام الکبیرؒ کے فیض صحبت کی اثر پذیری نے اس فیصلہ پر جب دیوان جی کو مجبور کیا کہ ''اپنے اقتداری دائرے میں تعزیہ داری کی رسم کو ختم کر کے رہوں گا۔ تو دیوبند کی تاریخ کا وہ ایک اہم واقعہ بن گیا۔

''محل کی مسجد جس میں مولانا حسین احمد صدر دارالعلوم دیوبند پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے، یہی مسجد دیوان جی کے محلّہ کی مسجد تھی، تعزیہ اس مسجد میں بھی رکھا جاتا تھا اور محرم میں اسی مسجد سے وہ تعزیہ اٹھتا تھا، اٹھانے والے سنی ہوتے تھے، کچھ شیعہ گھرانے بھی اس جگہ تھے، دیوان جی نے سب سے پہلے اپنے محلّہ کی اس مسجد کو تعزیہ کے قصہ سے پاک کرنے کا ارادہ کیا اور ''اعلان کر دیا کہ اس مسجد سے تعزیہ نہیں اٹھے گا۔''

یہ کوئی معمولی اعلان نہ تھا۔ دیوبند کی شیعہ آبادی ہی میں نہیں بلکہ تعزیہ پرست سنیوں میں بھی اس اعلان سے کھلبلی مچ گئی۔ پہلے تو ''اس محلّہ کے شیوخ بگڑ گئے اور کہا کہ سر قلم ہو جائیں گے، مگر تعزیہ اٹھے گا۔'' یہ سن کر دیوان جی کی زبان سے بھی بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ:

''اگر گذرا تو میری لاش پر گذرے گا۔''

اور بتدریج محلّہ سے آگے بڑھ کر فتنہ کی آگ سارے قصبہ میں پھیل گئی، قصبہ دیوبند کی ''شیوخ کی برادری دیوان جی کے خلاف متحد ہو گئی۔''

ظاہر ہے کہ یہ معمولی فتنہ نہ تھا، اس وقت دیوبند کے شیوخ کی برادری میں کافی ہیکڑی والے لوگ تھے، دیوان جی کے خلاف قصبہ کے شیوخ برادری کے اس اتحاد کو کافی

(۱) سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۶۷

اہمیت حاصل ہو گئی اندر ہی اندر جو کھچڑی پک رہی تھی اس کی خبر الامام الکبیرؒ تک بھی پہنچی۔

''حضرت نانوتویؒ کے علم میں جب یہ آیا اور معلوم ہوا کہ اس موقع پر شہر میں عظیم ترین ہنگامہ بپا ہونے کا خطرہ ہے۔''

تو ایک دن جب دیوان جی الامام الکبیر کی مجلس مبارک میں حاضر تھے، اسی مجلس میں ''شہر کے اکابر شیوخ اور دوسری برادریوں کے بڑے موجود تھے۔''

الامام الکبیرؒ دیوان جی کو مخاطب بنا کر فرمانے لگے کہ:

''بندۂ خدا! اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کم از کم مجھ سے ذکر تو کر لیا ہوتا۔''

یہ بات تو دیوان جی سے کہی گئی اور اس کے بعد اس بھری مجلس میں الامام الکبیر کی طرف سے بھی عام اعلان فرما دیا گیا کہ: ''لیکن خیر اب اگر ایسا کہہ دیا گیا ہے تو دوسرا سر قاسم کا لگا ہوا ہے۔''

مطلب یہ تھا کہ اپنی لاش پر دیوان جی نے اعلان کیا تھا کہ تعزیہ گذرے گا، اسی لاش کے ساتھ دوسری لاش جسے تعزیہ لے جانے والے اپنے قدموں کے نیچے پائیں گے وہ محمد قاسم کی لاش ہوگی۔

بھری مجلس کے اس خونی اعلان کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہی سامنے آیا۔

''جب یہ جملہ (یعنی قاسم کا سر بھی لگا ہوا ہوگا) شہر میں مشہور ہوا تو پیشہ ور برادریاں متحد ہو کر تیار ہو گئیں کہ اگر شیوخ نے دیوان محمد یٰسین صاحب کے ساتھ کوئی نازیبا برتاؤ کیا تو یہ ساری برادریاں ان شیوخ کے مدمقابل ہو جائیں گی۔''

پیشہ وروں کی یہ ساری برادریاں الامام الکبیرؒ سے غیر معمولی عقیدت کا تعلق رکھتی تھیں، یہ سننے کے ساتھ ہی کہ دیوان جی کے سر کے ساتھ الامام الکبیرؒ نے اپنے سر مبارک کو بھی باندھ دیا ہے۔ اس وقت اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کا اثر ان عقیدت مند مخلص مسلمانوں پر کیا مرتب ہوا ہوگا اور بات کچھ ان ہی پیشہ ور برادریوں تک محدود نہ رہی۔

''خود شیوخ میں بھی دو گروہ ہو گئے، بڑا گروہ وہ حضرت نانوتویؒ کی حمایت پر تُل گیا۔''

اور یوں واقعہ اس رنگ میں لوگوں کے سامنے آ گیا۔ ''گویا پورا شہر اُن شیوخ کے

مقابلہ کے لئے تیار ہوگیا۔‘‘

یوں بجائے ایک سر کے دیوان جی کے سر کے ساتھ دیکھا گیا کہ بے شمار سر لگے ہوئے ہیں۔

سارے شہر کے مسلمانوں سے مقابلہ کی ہمت آخر مخالفوں کا گروہ کیسے کر سکتا تھا۔ یوں ایک بڑے فتنہ کا بھی قلع قمع ہوگیا۔ باہمی خوں ریزی سے دیوبند والے بچ گئے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف ’’مسجد محل سے تعزیہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔‘‘

اور جب ایک جگہ سے یہ قدیم رسم اٹھ گئی تو ’’شہر کی جن جن سُنی مسجدوں میں سے تعزیئے اٹھتے تھے وہ سب ختم ہوگئے۔‘‘

ان کی اسی ہمت مردانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے بھی لکھا ہے کہ: ’’یہ واقعہ دیوان جی مرحوم کے حسنات میں سے ایک بہترین بلکہ سنتِ حسنہ ثابت ہوا۔‘‘

کوئی شبہ نہیں کہ دیوان جی کی ہمت مردانہ یقیناً مستحق تحسین وآفریں ہے لیکن طوطی کے ساتھ آئینہ کے پیچھے پیچھے سکھانے والے استاد پر جب نظر پڑتی ہے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ طوطی کی ساری گفتگو طوطی کی نہیں بلکہ اس کی تھی جو آئینہ کے پیچھے بیٹھ کر گفتگو کر رہا تھا۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ☆ انچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

خلاصہ یہ ہے کہ شیعی عقائد سے تائب ہوکر جو واقعی شیعہ تھے، وہ سنی ہوئے یا نہ ہوئے لیکن سنیوں میں جو کچے تھے، ان کے پکے بننے میں اور جو پکے تھے ان کو زیادہ پختہ بنانے میں الامام الکبیرؒ کی طرف سے جو عملی اقدامات ہوتے رہے یہ سب اسی کا اثر تھا۔

گویا خانوادۂ ولی اللّٰہی کی ساری محوری خدمات کو آگے بڑھانے اور ان کے دائرہ کی وسعت میں ممکنہ حد تک جتنا آپ کے بس میں تھا آخر عمر تک جدوجہد، سعی وکوشش کا سلسلہ آپ کی طرف سے مسلسل جاری رہا۔ الغرض ان سارے مسائل میں ولی اللّٰہی مسلک اور نقطۂ نظر کو ہندگیر عمومیت آپ ہی کی بدولت میسر آئی۔(۱)

............❖............

(۱) (سوانح قاسمی، ج۲،ص۷۷تا۷۸)